چودھویں کا چاند
Ferozsons Limited

چودھویں کا چاند

بچّوں کے لیے دلچسپ کہانی

سلیم احمد صدیقی

۱۹۷۵

کسی گاؤں میں دو میاں بیوی رہتے تھے۔ خدا نے انہیں سب کچھ دے رکھا تھا، لیکن اولاد نہ تھی۔ بس ایک اسی بات کا انہیں دکھ تھا۔ وہ بہت اداس رہتے تھے۔

آخر بڑی منّتوں مُرادوں کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس لڑکی کا نام انہوں نے غزّالہ رکھا۔ غزّالہ ہرن کے بچّے کو کہتے ہیں۔ غزّالہ کی آنکھیں ہرنوں کی آنکھوں کی طرح تھیں اور وُہ بڑی ہی خوبصورت تھی۔ ماں باپ اس کو دیکھ دیکھ کہ پھولے نہیں سماتے تھے۔

غزّالہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور بڑے ہی ارمانوں کے بعد ہوئی تھی، اس لیے ماں باپ اس کی ہر جا اور بے جا بات مانتے تھے۔ جو بات بھی اس کے مُنہ سے نکلتی، فوراً پوری کر دی جاتی۔

ماں باپ کے لاڈ پیار سے غزّالہ بُہت شریر اور ضدّی ہو گئی تھی، وہ بہت ذہین تھی لیکن اپنے دماغ سے اچھا کام کبھی نہ لیتی۔ بس روز نت نئ شرارتیں سوچتی رہتی۔ صبح کو آیا اس کا منہ ہاتھ دھلانے لے جاتی تو وہ ہمیشہ ضد کرتی اور کہتی کہ میں منہ نہیں دھوتی اور جب منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کرنے بیٹھتی تو طرح طرح کے نخرے

دکھاتی۔ آپا چائے میں کم چینی ڈالتی تو وہ پیالی توڑ دیتی اور چینی زیادہ ڈالتی تھی تو بھی پیالی توڑ دیتی اور اسے خوب برا بھلا کہتی۔ غرض بات بات پر لڑتی اور روزانہ کئی پیالیاں ٹوٹتی تب کہیں جا کر ناشتا کرتی۔

جب وہ اپنی امّی کے ساتھ کسی کے ہاں جاتی تو کبھی آرام سے نہیں بیٹھتی تھی۔ ہمیشہ اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی اور جو چیز بھی اسے اچھّی لگتی، بے سھڑک اُٹھا لیتی اور جھٹ پٹ اُسے توڑ تاڑ کر برابر کر دیتی۔

اسی طرح جب اس کی امّی کی سہیلیاں اس کے گھر آتیں تو وہ ہمیشہ ان کی بات کو درمیان میں سے کاٹ دیا کرتی اور پانچ منٹ بھی انہیں بات نہ کرنے دیتی تھی۔ اس کی امّی اور سہیلی کوئی بات شروع کرتی ہی تھیں کہ وہ امّی کی سہیلی کے گھٹنوں پر چڑھ جاتی اور ان کی بات کاٹ کر کہتی: "خالہ، خالہ۔ میں آج باہر گئی تھی۔۔۔ اور وہاں میری آپا بھی میرے ساتھ گئی تھی۔ لیکن میری آپا ہے بڑی وہ۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے دہی بڑے کھلا دو تو کہنے لگی کہ سردیاں ہیں، تمھیں زکام ہو جائے گا۔ ہم آگے چلے تو میں نے کہا کہ مجھے امرُود لے دو، تو کہنے لگی کہ نہیں۔ یہ

تو گلے سڑے ہیں۔ خالہ جی، آپ ہمارے لیے امرُود کیوں نہیں لے کر آئیں؟"

اب بھلا خالہ جی کیا جواب دیں؟ وہ کھسیانی سی ہو کہ اس سے کہتیں۔ "بھئی، میں بھُول گئی۔ اگلی دفعہ ضرور لے کر آؤں گی۔"

غزّالہ کی امّی کی سہیلیاں تو سب کی سب ہی خوش اخلاق تھیں۔ وہ غزّالہ کی بد تمیزیوں کو برداشت کر جاتی تھیں اور اسے ڈانٹ ڈپٹ نہ کرتی تھیں لیکن جانور تو خُوش اخلاق نہیں جانتے۔ بعض سہیلیوں نے کتّے یا بلّیاں پالی ہوئی تھیں۔ غزّالہ ان کے ہاں جاتی تو بلّی کو بھی تنگ کرتی۔ اتنا تنگ کرتی کہ جانور بے چارہ تنگ آ جاتا۔

ایک دن غزّالہ اپنی امّی کے ساتھ اُن کی ایک سہیلی کے گھر گئی جنھوں نے ایک موٹا تازہ کتّا پالا ہوا تھا۔ ابھی اُس نے دروازے کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ وہ کتّے کو ستانے لگی۔ کبھی اس کے کان کھینچتی، کبھی اس کی دم مروڑتی اور کبھی اسے اور طرح سے تنگ کرتی۔ پھر وہ ان کے باورچی خانے میں جا کے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا لائی اور کتّے کو دکھانے لگی۔ کتّے کو غصّہ آ رہا تھا لیکن وہ اپنا غصّہ پی کر روٹی لینے

کے لیے غزّالہ کی طرف لپکا تو غزّالہ نے روٹی والا ہاتھ پیچھے کر لیا اور دوسرا ہاتھ جو خالی تھا، اس کے آگے کر دیا۔ وہ اپنے خیال میں کتّے کو چھیڑ رہی تھی، لیکن کتّا تنگ آ چکا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم لپک کر اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔

غزّالہ وہیں زمین پر لوٹ گئی اور رو رو کے اس نے اپنی دونوں آنکھیں سُجا لیں۔ غزّالہ کے ابّا دوڑے دوڑے ڈاکٹر کو لے کر آئے، جس نے آ کے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور پھر ذرا سا مرہم لگا کہ کہنے لگا، "بس بی بی، بس۔ زیادہ رونے کی ضرُورت نہیں۔ وہ تو بے چارہ کتّا ہی شریف ہے کہ اس نے تمہارے زور سے نہیں کاٹا۔ دیکھو تو سہی تمہارے ہاتھ پر دانت کا نشان تک بھی تو نہیں پڑا۔ اگر نشان پڑ جاتا تو پیٹ میں ٹیکے لگوانے پڑتے۔"

اس کے بعد سے غزّالہ جانوروں کو تو ذرا کم ستانے لگی، لیکن اس کی باقی عادتیں ویسی کی ویسی ہی تھیں۔ وہ روزانہ چائے کی کئی کئی پیالیاں توڑ دیتی تھی۔ روز کئی کئی فراک کھیل میں میلے کر دیتی جو اس کی آیا کو دھو کر استری کرنے پڑتے تھے۔

☆☆☆

گرمیوں کے دن تھے اور اناج کی فصل کٹ رہی تھی۔ غزّالہ سارا دن کھیت میں فصل کٹتے دیکھتی رہی تھی اور اِدھر اُدھر اودھم مچاتی پھرتی رہی تھی۔ فصل کاٹنے والے یہ سوچ رہے تھے کہ کاش! وہ اس وقت کھیت میں نہ ہوتی، کیونکہ کبھی وہ کسی کی درانتی اُٹھالیتی، کبھی کسی کے بندھے ہوئے گٹھے کو کھول دیتی۔ غرض اسی طرح سب کو ستاتی پھر رہی تھی۔

جب سہ پہر کی چائے کا وقت ہوا تو لوگوں نے سوچا کہ اب تو غزّالہ چائے پینے گھر چلی جائے گی اور اب وہ آرام سے کام کر سکیں گے لیکن غزّالہ نے آیا سے کہا۔ ”میں تو یہیں کھیت میں چائے پیوں گی۔ اور جب آیا نے اس کی امّی سے جا کر شکایت کی کہ غزّالہ بی بی تو کھیت میں چائے پینے کی ضد کر رہی ہیں تو انہوں نے کہا۔ ”اے ہے، تو کیا ہُوا؟ میز کُرسی اٹھا کے وہاں لے جاؤ۔ بے چاری بچّی ہے۔ جی چاہ رہا ہو گا کھلی ہوا میں چائے پینے کو۔“

مجبوراً آیا کو وہیں چائے لانا پڑی۔ غزّالہ نے کھیت ہی میں چائے پی۔ اس کے بعد

شام تک شرارتیں کرتی رہی۔ ایک دفعہ وہ گٹھّوں پر سے نیچے گر پڑی مگر خیریت گزری کہ زیادہ چوٹ نہ لگی۔ آخر خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ کھیت میں کام بند ہو گیا۔ کیونکہ اب اندھیرا چھانے لگا تھا، غزّالہ گھر کے اندر چلی گئی۔ اس کی آپا نے اسے شام کا کھانا کھلایا اور پھر اُسے سُلانے کے لیے لوری دینے لگی۔ غزّالہ نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ چاند نکل آیا ہے اور سارے کھیت میں چاندی پھیلی ہوئی ہے۔

”میں باہر جانا چاہتی ہوں۔“ غزّالہ نے کہا۔ ”وہ لوگ صبح سویرے میرے جاگنے سے پہلے پہلے، اناج کے گٹھے اُٹھا کے لے جائیں گے۔ پھر میں کیسے اُن پر کھیل سکوں گی؟ میں ابھی کھیت میں جانا چاہتی ہوں۔“

”میری پیاری غزّالہ۔“ آپا نے کہا۔ ”تم باہر نہیں جاؤ گی۔ اچھے بچّے اس وقت باہر نہیں جایا کرتے۔“

”نہیں۔ میں ضرور باہر جاؤں گی۔“ غزّالہ نے ضد کی۔

”اچھّا، تم اپنے امّی ابّو سے پوچھ لو۔ اگر وہ کہیں تو پھر چلی جانا۔“ آپا نے یہ کہہ کر

اپنی جان چھڑائی۔ وہ جانتی تھی کہ غزّالہ اس کی بات کبھی نہیں مانے گی۔

"میں باہر کھیت میں جانا چاہتی ہوں۔" غزّالہ نے امّی سے کہا۔

"نہیں، میری پیاری بچّی۔" امّی نے کہا۔ "تمہیں اس وقت باہر نہیں جانا چاہیے۔"

"میں جاؤں گی۔" غزّالہ نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔ "اُوں اُوں۔۔۔"

"تم اچھے بیٹے ہو۔" ابّو نے کہا۔ "جاؤ سو جاؤ۔ ضد نہیں کرتے۔" غزّالہ پھر آیا کے پاس آ گئی۔

"وہ مُجھے کیوں نہیں جانے دیتے؟" اس نے آیا سے پوچھا۔ "اس لیے بیٹے کو چاندنی رات میں کھیتوں میں پریاں اور بَونے آ جایا کرتے ہیں۔ اس وقت آدمیوں کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔ وہ انہیں پکڑ کر لے جاتے ہیں اور پھر وہ واپس زمین پر نہیں آتے۔"

"اچھا!" غزّالہ نے کہا۔ "تو پھر میں نہیں جاتی۔" یہ کہہ کر وہ آنکھیں میچ کے لیٹ

گئی۔ آپا اسے لوری سُنانے لگی۔ آج غزّالہ کو بُہت جلدی نیند آ گئی اور تھوڑی دیر بعد آپا بھی سو گئی کیونکہ وہ بے چاری غزّالہ کا کام کر کر کے تھک کر چور ہو چکی تھی۔

آپا کے سوتے ہی غزّالہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سوئی تھوڑا ہی تھی۔ وہ تو آپا کو دکھانے کے لیے جھوٹ موٹ سوئی بن گئی تھی تاکہ آپا جلدی سے سو جائے اور پھر وہ اُٹھ کر باہر جا سکے۔ اس نے ہولے سے کمرے کی کُنڈی کھولی، برآمدے میں آئی پھر باہر کی کُنڈی کھولی اور کھیت میں آ گئی۔

باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور یُوں لگتا تھا جیسے ہر چیز سوئی ہوئی ہو، مگر پھر بھی جاگ رہی ہو۔ غزّالہ کو یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگا۔ اُسے ہلکی ہلکی خاموش آوازیں سی سنائی دے رہی تھیں۔ اُس نے اپنے اِرد گرد دیکھا۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ وہاں پھر یہ آوازیں، ہلکی ہلکی خاموش آوازیں، کہاں سے آ رہی تھیں؟

جُوں جُوں غزّالہ قدم آگے بڑھاتی، اُسے یُوں لگتا جیسے اس کے پیچھے پیچھے کوئی آ رہا ہو۔ وُہ پیچھے مُڑ کر دیکھتی تو اسے کوئی نظر نہ آتا۔

اب وہ کھیت کے اس حصّے میں پہنچ گئی جہاں گیہوں کے گٹھّے پڑے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر اُسے کھُسر پھُسر کی سی آواز سُنائی دی۔ اس نے سمجھا کہ اس کے کان بج رہے ہیں، لیکن جب اس نے اپنے دائیں طرف اناج کے ایک گٹھّے کی جانب نظر کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ سُرَر سُرَر کی آواز وہیں سے آ رہی ہے اور وہ گٹھّا ہلکے ہلکے ہل بھی رہا ہے!

غزّالہ اُس گٹھّے کے نزدیک گئی۔ اس نے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس گٹھّے میں سے ایک ننھّا مُنّا سا آدمی سبز کپڑے پہنے نکل رہا تھا۔ یہ ایک بَونا تھا۔ چھوٹا بَونا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں تھے اور چھوٹا سا سر تھا۔ پاؤں میں نازک نازک سے دو جُوتے تھے جن میں دھاگے کی طرح بارِیک تسمے بندھے ہوئے تھے۔

گٹھّے سے باہر آ کر بَونے نے سب سے پہلے اپنے کپڑے جھاڑے اور پھر گیہُوں کی ایک بالی لی اور اس کے نچلے سِرے کو مُنہ میں پکڑ کر سیٹی کی طرح بجایا۔ غزّالہ کا خیال یہ تھا کہ بجایا ہو گا کیونکہ اسے اس سے نکلنے والی آواز سنائی نہیں دی سکتی۔

لیکن اس کے بجتے ہی بہت سارے بَونے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے گٹھّوں میں سے باہر نکل آئے اور سب نے اپنے اپنے کپڑے جھاڑنے شروع کر دیے۔ کئی بَونوں کو کپڑے جھاڑتے وقت چھینکیں بھی آئیں جن کی ہلکی ہلکی آواز غزّالہ نے سُنی۔

"کیا آج رات ہم اپنا جشن یہاں منا سکتے ہیں؟" سبز لباس والے بَونے نے پُوچھا۔

"نہیں۔" دوسرے بَونے نے جواب دیا۔ "یہاں تو ہر طرف غزّالہ کے میلے فراک پڑے ہیں۔"

سبز لباس والا بَونا دوسرے گٹھّے کی طرف گیا اور اس میں سے نکلے ہوئے ایک بَونے سے پوچھا: "کیا آج رات ہم اپنا جشن یہاں منا سکتے ہیں؟"

"نہیں۔" بَونے نے جواب دیا۔ "یہاں تو ہر طرف غزّالہ کے توڑے ہوئے چینی کے برتنوں کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ ہم یہاں ناچیں گے تو ہمارے جُوتے پھٹ جائیں گے اور پاؤں لہولہان ہو جائیں گے۔ نہیں، ہم یہاں نہیں ناچ سکتے۔"

”چچ چچ!“ سبز لباس والے بَونے نے کہا۔ ”وُہ بہت اداس نظر آ رہا تھا۔ اب وہ ایک اور گٹھّے کے پاس گیا اور اس کے پاس کھڑے ہوئے ایک بَونے سے پوچھا۔ ”کیوں بھئی، آج رات ہم یہاں جشن منا سکتے ہیں؟“

”نا بھئی نا۔“ بَونے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھتے نہیں چاروں طرف غزّالہ کا بچا کھُچا کھانا بکھرا پڑا ہے۔ اب ہم کھانے پر تو پاؤں رکھ کر نہیں ناچ سکتے نا“!

”اُفّوہ! اب کیا کریں؟“ سبز لباس والے بَونے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”اب ہم جشن کیسے منائیں؟ کتنے دِنوں کے بعد تو ہمیں ایک رات ملتی ہے کہ جشن منا سکیں۔ اوہو! یاد آیا۔ اُدھر والے بھائی سے تو ابھی میں نے پوچھا ہی نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اناج کی ایک ڈھیری کے پاس کھڑے ہوئے ایک بَونے کے پاس پہنچ کر کہنے لگا۔ ”یہاں جشن منا سکتے ہیں؟“

”نہیں بھئی۔ مُجھے افسوس ہے کہ ہم آج رات یہاں جشن نہیں منا سکتے۔ دیکھنا تو ذرا، ساری جگہ پر ٹوٹے ہوئے دھاگے پڑے ہیں۔ اگر ہم چلیں گے تو ہمارے پاؤں اِن دھاگوں میں اُلجھ جائیں گے اور ہم گِر جائیں گے۔“

"مگر اتنے سارے دھاگے آئے کہاں سے؟" سبز لباس والے بَونے نے حیرت سے اِدھر اُدھر بکھرے ٹوٹے دھاگوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے؟" دوسرے بَونے نے کہا۔ "یہ اُن باتوں کے دھاگے ہیں جو غزّالہ نے بیچ میں سے کاٹ کاٹ کر بے کار کر دی ہیں۔"

"ان میں تو ہم واقعی اُلجھ کر گر جائیں گے۔" سبز لباس والے بَونے نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "غزّالہ یہاں آجائے تو میں اس کی اچھّی طرح خبر لوں گا۔"

"اور میں بھی اُسے بُہت ستاؤں گا۔" دوسرے بَونے نے کہا. اس نے ہمارے جشن کو تباہ کر دیا ہے۔ بھلا ایسی رات کہیں روز روز آتی ہے؟ اتنے دنوں بعد تو چودھویں کے چاند کی رات آئی تھی۔ مجھے تو غزّالہ پر بہت ہی غصّہ آرہا ہے۔ اگر وہ یہاں آجائے تو میں اسے کچّا ہی چبا جاؤں۔"

غزّالہ کو یہ باتیں سُن کر ہنسی آگئی۔ "ارے! یہ اتنے اتنے سے بَونے کتنے دھُوم دھڑکے سے اسے سزا دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ آخری یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟" اس نے سوچا۔ "میں انہیں مزا چکھا دوں گی۔ یہ آخر کہاں

کے گاما پہلوان ہیں کہ مجھے سزا دینے کے منصوبے بنا رہے ہین۔"

یہ سوچ کر وہ زور سے چلّائی۔ "ارے بَونو! اناج کے گٹھّے اور یہ کھیت سب کُچھ میرے ابّو کا ہے۔ میں جو چاہوں یہاں کر سکتی ہوں۔ تم کون ہو میرے معاملے میں دخل دینے والے؟"

"اری چوہیا۔" سبز لباس والا بَونا زور سے چلّایا: "تم نہیں جانتیں کہ دنیا میں چیزوں کا بٹوارا کس طرح سے ہوتا ہے؟ آؤ، میں تمھیں بتاؤں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے لباس کا دامن ایک ہاتھ میں پکڑ کر ناچنے لگا اور یُوں گانے لگا:

"جو کچھ ہے سورج کے نیچے
وہ انسانوں کا ہوتا ہے
پر جب سورج آنکھیں میچے
ٹھنڈے پیلے چاند کے نیچے
تو پھر جو کُچھ کھیتوں میں ہے
پریوں، بَونوں کا ہوتا ہے

آہا، آہا، اوہو، اوہو!

ٹھنڈے پِیلے چاند کے نیچے

سب کچھ بَونوں کا ہوتا ہے۔"

جب سبز لباس والا بَونا گا اور ناچ رہا تھا تو غزّالہ کے جی میں آئی کہ یہاں سے بھاگ چلے، لیکن بَونا اس کے چاروں طرف اتنی تیزی سے گھوم رہا تھا کہ بھاگنے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ جدھر کو غزّالہ اپنا مُنہ کرتی، بَونا اُسی طرف آ کر ٹھمکے لگانے لگتا اور باقی سب بونے بھی اس کے ساتھ مل کر گانا شروع کر دیتے:

ٹھنڈے پِیلے چاند کے نیچے سب کچھ بَونوں کا ہوتا ہے

آہا، آہا، اوہو، اوہو!

"اور اب تمھیں کام کرنا پڑے گا۔ چلو!" بَونے نے غزّالہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

غزّالہ نے دیکھا کہ اس کے چاروں طرف بے شمار بَونے کھڑے ہیں اور وُہ کسی طرف کو بھی بھاگ نہیں سکتی۔ مجبور ہو کر اس نے ایک بونے کی طرف بڑھنا چاہا

کہ اسے گِرا کر راستہ بنالے اور وہاں سے نِکل جائے مگر اُسی لمحے وہ بونا اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیااور اس کے پاؤں کے تلووں میں گُدگُدی کرنے لگا۔ غزّالہ اب بھاگ نہ سکتی تھی۔ اس نے بَونے سے کہا۔ ”خدا کے لیے میرے پاؤں میں گُدگُدی نہ کرو۔“

سبز لباس والے بَونے نے دوسرے بَونے کو روک دیااور غزّالہ سے کہا۔ ”اب سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلی چلو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو ہم تمہارے گُدگُدی کرنے لگیں گے۔“

غزّالہ چپ پاپ اُن کے ساتھ چل دی۔ بَونے اُسے قریب ہی پڑے ہوئے گٹھّوں کے ڈھیر میں لے گئے۔ اس ڈھیر کے اندر جاکر غزّالہ نے دیکھاکہ وہاں ڈھیر سارے بَونے موجود ہیں۔ سبنر لباس والے بَونے نے ان سے کہا۔ ”یہ رہی غزّالہ کی بچّی، جس کی وجہ سے آج ہم جشن نہیں مناسکے۔“

”ہاہاہا! اب ہم اس سے بدلہ لیں گے۔“ سب بَونے چلّائے۔

”ایک پُتلالاؤ۔“ سبز لباس والے بَونے نے حکم دیا۔

یہ سُنتے ہی پانچ چھ بَونے اُٹھے اور تھوڑی دیر بعد نہ جانے کہاں سے ایک گڑیا لے آئے جو بالکل غزّالہ جیسی تھی۔ اُسی جیسی آنکھیں۔ اُسی جیسا چہرہ۔

"کیا ہم اس پُتلے کو غزّالہ کے گھر چھوڑ آئیں؟" بَونوں نے سبز لباس والے بَونے سے پُوچھا۔ اب غزالہ سمجھی کہ سبز لباس والا بَونا بَونوں کا سردار ہے۔

"نہیں۔" بَونوں کے سردار نے کہا۔ "اسے ایک گٹھّے کے پاس لِٹا دو۔ غزّالہ کے امّی ابّو آ کر اس پُتلے کو لے جائیں گے۔ وُہ اس کو غزّالہ سمجھ کر اپنے گھر میں رکھیں گے اور غزّالہ ہمارے ساتھ رہے گی۔"

غزّالہ بَونے کی یہ بات سُن کر بہُت ڈری اور چیخنے لگی۔ لیکن بَونوں نے اسے گیہوں کے گٹھّوں میں بہُت نیچے دھکیل دیا تاکہ اس کی آواز اس کے امّی ابّو تک نہ جا سکے۔

گیہوں کے گٹھّوں کے نیچے طرح طرح کے خُوب صورت پھُول کھلے ہوئے تھے اور ننھی مُنی گھنٹیاں لٹک رہی تھیں۔ غزّالہ یہ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ جب دِن میں کسان گندم کاٹ کاٹ کر گٹھّے بنا رہے تھے تو ان میں ایسی کوئی بھی

چیز نہ تھی۔ پھر آخر شام ہوتے ہی گٹھّوں میں یہ سب کُچھ کہاں سے آ گیا؟

کوئی اور وقت ہوتا تو غزّالہ یہ سب کُچھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی لیکن اب تو وہ سہمی سہمی نظروں سے ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ بَونے اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں!

تھوڑی دیر بعد غزّالہ کے امّی، ابّو اور آپا اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور کھیت میں پڑے ہوئے پُتلے کو غزّالہ سمجھ کر اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ غزّالہ کے لیے اپنی جان بچانے کا یہ آخری موقع تھا۔ وہ پورے زور سے چلّائی۔ "امّی! میں یہاں ہوں۔ ابّو میں یہاں ہوں۔ گٹھّوں کے اس ڈھیر کے نیچے۔"

غزالہ کی امّی نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی۔ "یہ کیسی آواز ہے؟"

"کچھ نہیں۔" ابّو نے کہا۔ "یہ تو جھینگروں کا شور ہے۔ جھینگر ساری رات چی چی می چی، چی چی می چی کرتے رہتے ہیں۔"

نقلی غزّالہ (پُتلے) نے اُسی لمحے ایک آہ بھری اور امّی اور ابّو اسے اٹھا کہ پیار کرتے

ہوئے گھر لے چلے۔ ان کا خیال تھا کہ غزّالہ تو ڈر کر بے ہوش ہو گئی ہے، یا اسے ہوا لگ گئی ہے اور وُہ بیمار ہو گئی ہے۔

”ہائے۔“ پُتلے نے ایک اور آہ بھری۔ امّی نے جھٹ اُسے غزّالہ سمجھتے ہوئے سینے سے لگا لیا اور پیار سے بولیں۔ ”ہائے میری پیاری غزّا۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔ آلہ۔ تُجھے کیا ہو گیا میری بیٹی؟“

”اس کی آنکھوں میں چھُو چھَم کا سرمہ لگا دیا جائے۔“ بَونوں کے سردار نے حکم دیا۔ دو بَونے آگے بڑھے اور زبردستی غزّالہ کی آنکھوں میں سُرمے کی ایک ایک سلائی لگا دی۔ اس سلائی کے لگاتے ہی غزّلہ کو بَونوں کی طرح ہر چیز ٹھیک نظر آنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے امّی ابّو جس پُتلے کر غزّالہ سمجھ کر لے جا رہے تھے، وہ تو بھدّی صُورت کا بَونا تھا اور اس کا مُنہ لنگور جیسا تھا۔

ابھی وہ حسرت سے اپنے امّی ابّو کو پُتلا لے جاتے ہوئے دیکھ ہی رہی تھی کہ بَونوں کے سردار نے حکم دیا۔ ”اِسے نیچے لے چلو“!

اچانک زمین بیچ میں سے پھٹی اور غزّالہ کو نیچے دھکیل دیا گیا۔ وہ ڈر کے مارے بے

ہوش ہو گئی۔

☆☆☆

غزّالہ کو ہوش آیا تو نہ اِرد گرد کھیت تھے اور نہ مکان۔ نہ وہاں چاندی چھٹکی ہوئی تھی، نہ سورج کی روشنی تھی۔ اور رات کا سا اندھیرا تھا۔ یہ تو عجیب سی دنیا تھی کوئی! نہ یہاں دِن تھا، نہ رات۔ نہ چاند تھا، نہ سورج، نہ ستارے۔ بس ایک دھیمی دھیمی سی مدّھم روشنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ پھُول کھلے ہوئے تھے جو کبھی کسی رنگ کے نظر آتے اور کبھی کسی رنگ کے۔ ایک بات اُسے بڑی عجیب لگی۔ جب یہ پھول ایک رنگ کے ہوتے تو ان میں سے ایک طرح کی خوشبو آتی اور جب رنگ دوسرا ہوتا تو خُوش بو کسی اور قسم کی آنے لگتی۔

البتّہ ایک چیز وہاں بہت خراب تھی۔ جگہ جگہ راستے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ کپڑے تھے جو غزّالہ نے اب تک میلے کیے تھے۔ غزّالہ ان کپڑوں کو دیکھتے ہی فوراً پہچان گئی کہ یہ وہی کپڑے ہیں۔

"تمھیں سب کپڑے دھونے پڑیں گے۔" غزّالہ کو اپنے پیچھے سے آواز آئی۔ یہ

وہی سبز لباس والا بَونا تھا جو سب کا سردار تھا اور غزّالہ کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ یہ بات اُسی نے غزّالہ سے کہی تھی۔

"میں انہیں نہیں دھو سکتی۔" غزّالہ نے مُنہ بنا کر کہا۔ "انہیں میری آیا کے پاس بھیج دو۔ وہ دھو دے گی۔ کپڑے دھونا اسی کا کام ہے۔"

"تم اس وقت ہماری دنیا میں ہو، لڑکی۔" بَونے نے غرّا کر کہا۔ "یہاں کا اصول یہ ہے کہ جو کرتا ہے، وہی بھرتا ہے۔ یہ کپڑے تم نے میلے کیے ہیں، تمھی انہیں دھو گی۔ اگر تم انہیں نہیں دھو گی تو۔۔۔" "ٹھہرو! ٹھہرو!" غزّالہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"بولو، کیا کہنا چاہتی ہو۔" بَونے نے پوچھا۔

"میں کپڑے دھونا نہیں جانتی۔" غزّالہ بولی۔

"وہ عورت تمھیں سکھا دے گی۔" بَونے نے اپنے جُوتے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ذرا دُور ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جو بالکل خانہ بدوش سی لگ رہی تھی۔ وُہ

کے چولھے پر کچھ پکا رہی تھی۔ مگر یہ عورت سچ مچ کی عورت تھی۔ کوئی بَونی، چڑیل یا پری نہ تھی۔ اس عورت کو بَونے اوپر کی دنیا سے لائے تھے اور اب وہ اِن بَونوں کا کام کاج کیا کرتی تھی۔ اُسے اس دنیا میں آئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔

عورت نے غزّالہ کو بتایا کہ کپڑے پر صابن کیسے لگاتے ہیں، انہیں ملتے کیسے ہیں، نِیل کیسے دیتے ہیں، کَلَف کیسے لگاتے ہیں اور سوکھنے کے بعد استری کیسے کرتے ہیں۔ غزّالہ نے شروع شروع میں اس کام کو کرنے میں بہت مشکل محسوس کی لیکن آہستہ اب اسے کچھ عادت سی ہو گئی۔ اس نے پہلے ایک کپڑا دھویا، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ کپڑے مَلتے مَلتے اور پٹختے پٹختے اس کے ہاتھ درد کرنے لگتے تو وُہ چند منٹ کے لیے رُک جاتی۔ اس پر بَونوں کا سردار اس کے پاس آ کر کہتا۔ ”تم یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں آئی ہو۔ کام کرو کام۔۔۔ جو کُچھ نے زمین پر بگاڑا ہے، یہاں تمہیں سنوارنا پڑے گا۔ اس لیے کام جلدی جلدی کرو۔“

غزّالہ بے چاری پھر سے ہمّت باندھتی اور کپڑے دھونا شروع کر دیتی۔ کپڑے دھوتے دھوتے اسے بھُوک لگی۔

اُس نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک بَونے سے کہا۔ ”مجھے بھُوک لگ رہی ہے۔“

”ہاں ہاں تمھیں کھانا ضرُور ملے گا۔“ بَونے نے نرمی سے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

یہ بَونا اُسے ساتھ لے کر ایک دُکان پر گیا جہاں ایک بَونا کھانے پینے کا سامان لیے بیٹھا تھا۔

”کیا کھاؤ گی تُم؟“ بَونے نے پوچھا۔

”میں کوفتے کھاؤں گی۔“ غزّالہ نے جواب دیا۔

”یہ لو کوفتے۔“ دُکان دار بَونے نے اُسے تھوڑا سا گوشت اور مسالا دے دیا۔ غزّالہ نے حیرت سے کہا۔ ”مگر یہ تو کچّا گوشت ہے۔ میں اس کا کیا کروں گی؟ میرا تو بھُوک کے مارے بُرا حال ہُوا جا رہا ہے۔“

اتنے میں بَونوں کا سردار اس کے پاس آ گیا۔ وہ بولا۔ ”یہ تمہاری دُنیا نہیں ہے۔

یہ ہماری دُنیا ہے، یہاں ہر آدمی کو اپنے کھانے کے لیے خُود ہی پکانا پڑتا ہے۔ جو کچھ کھانا چاہتی ہو، شوق سے کھا سکتی ہو لیکن تمہیں خُود پکانا ہو گا۔"

"لیکن مُجھے تو پکانا نہیں آتا۔" غزّالہ نے بے بسی سے کہا۔ اسے زبردست بھُوک لگی تھی۔ "اور پھر مُجھے بھُوک بھی بہُت لگ رہی ہے۔"

"وُہ سامنے جو عورت بیٹھی ہے، وہ تمہیں پکانے کا طریقہ سکھا دے گی۔ تُم جو چاہو، پکاؤ اور کھاؤ۔" بَونے نے کہا۔

غزّالہ اس عورت کے پاس گئی جو دُور بیٹھی کچھ کام کر رہی تھی۔ اس نے عورت سے کھانا پکانے کا طریقہ سیکھا۔ اس کے بعد اس نے کوفتے پکانے کے بجائے آسان سا کھانا پکایا کیونکہ اسے بھُوک بہت ستا رہی تھی۔ جو کچھ بھی اُس سے پکا، وہی کھا پی لیا۔

ابھی اس نے کھانا کھایا ہی تھا کہ بَونے اُسے لینے آ گئے۔ "ابھی تمہارے چند کپڑے باقی ہیں۔ انہیں بھی چل کے دھوئو۔" انہوں نے کہا۔

غزالہ کی وُہ کپڑے بھی دھونے پڑے۔ آخر خُدا خدا کر کے کپڑے دُھلے۔ لیکن اس کے بعد اسے ایک اور کام کرنا پڑا۔ جتنے کپڑے بھی اس نے ضِد میں پھاڑے تھے، وہ سب اُسے سینے پڑے۔ سینا بھی اُسے اسی عورت نے سکھایا جس نے کھانا پکانا سکھایا تھا۔

اب اس عورت سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ رات کو وہ اسی کے پاس آ کر سوتی۔ سونے سے پہلے وہ دونوں باتیں کرتے۔ غزّالہ کبھی کبھی اس عورت کا کھانا بھی پکا دیتی اور کبھی کبھار اُسے کوئی چھوٹا موٹا گیت بھی سُنا دیتی تھی جسے سُن کر وہ بُہت خُوش ہوتی کیونکہ زمین پر سے آئے ہوئے اُسے بہت دِن ہو چکے تھے۔

"مَیں نے کتنا اچھّا کیا کہ کھانا پکانا سیکھ لیا اور کپڑے دھونا بھی۔" غزّالہ نے کہا۔ "ہر کام جو آدمی سیکھتا ہے، اس سے اُسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔

کپڑے سینے کے بعد اُسے ان سب پر استری کرنی پڑی۔ اس کے بعد وہ عورت سے پُوچھنے لگی۔ "اب تو کپڑے ٹھیک ٹھاک ہو گئے ہیں۔ میں واپس جا سکتی ہوں نا؟"

”ابھی نہیں۔“ عورت نے کہا۔ ”ابھی تمھیں وہ تمام برتن جوڑنے پڑیں گے جو تم نے چائے پیتے اور کھانا کھاتے وقت توڑے ہیں۔“

”لیکن جب میں سارے کام کروں گی، پھر تو بَونے مُجھے زمین پر جانے دیں گے نا؟ میرا کتنا جی کرتا ہے کہ میں اپنے امّی اور ابّو کے پاس واپس چلی جاؤں۔“

”اس کے بارے میں نہیں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ عورت نے کہا۔

غزّالہ یہ سُن کر رونے لگی۔ عورت نے اپنے دوپٹّے کے پلّو سے اُس کے آنسو پونچھے اور تسلّی دیتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بس بس۔ رو نہیں میری بچّی۔ بَونے رونا پسند نہیں کرتے۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ تم رو رہی تھیں تو تمھیں سزا دیں گے۔ یہاں سب خوش رہتے ہیں، اس لیے تُمھیں بھی خُوش رہنا پڑے گا۔ باقی رہی یہاں سے واپس جانے کی بات، تو وُہ بُہت مشکل ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ غزّالہ نے کہا۔

”اس لیے کہ جب تم یہاں آئی تھیں تو نکمّی اور جھگڑالو تھیں۔ تمھیں کوئی بھی بَونا

پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب تم کام کرنا سیکھتی جا رہی ہو اور اچھّی لڑکی بن گئی ہو۔ اب تم بَونے کبھی بھی تمھیں واپس نہیں جانے دیں گے۔ وُہ پیارے بچّوں کو بُہت پسند کرتے ہیں۔"

"اب کیا ہو گا؟" غزّالہ نے کہا۔ "میں اپنی امّی کے پاس کیسے جاؤں گی؟"

"ارے ہاں۔ ایک ترکیب ہے، جو اچانک میرے ذہن میں آ گئی ہے۔ کیا تم ناچنا جانتی ہو؟" عورت نے کہا۔

"ہاں۔ میں ناچ سکتی ہوں۔" غزّالہ نے کہا۔

"بس، تو پھر تمہارا کام بن سکتا ہے۔ تُم ایسا کرو کہ اپنے خالی وقت میں ناچا کرو۔ بَونے ناچ بُہت پسند کہتے ہیں۔ وُہ تمھیں ناچتا دیکھیں گے تو بُہت خُوش ہوں گے۔"

"لیکن اس سے کیا ہو گا؟" غزّالہ نے پُوچھا۔

"جب وُہ سب ناچنے کے لیے زمین کے اُوپر تمہاری دنیا میں جائیں گے تو تمھیں

بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"لیکن پھر بھی وہ مجھے میرے گھر تو نہیں جانے دیں گے۔۔۔ میں یہاں آنا نہیں چاہتی تھی۔ وُہ مجھے زبردستی اُٹھا لائے۔ وُہ اتنے سارے ہیں اور میں اکیلی۔ میں ان سے کیسے بچ کر نکل سکتی ہُوں؟"

"میں تمہیں ایک ترکیب بتاتی ہوں۔" عورت نے کہا۔ "تمہیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔ ناچتے ناچتے جب تمہیں چار پنکھڑیوں والا کوئی پھُول نظر آ جائے تو تم چپکے سے اسے توڑ لینا اور اُسے ہاتھ میں لے کر کہنا کہ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ تب تمہیں کوئی نہیں روک سکے گا۔"

"سچ؟" غزّالہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"لیکن یہ سب کچھ تبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ تم بَونوں کو خُوش رکھ سکو۔ اس کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو تم ہر کام خوشی سے کرو، جو بھی وُہ تمہیں کرنے کو کہیں اور دوسری بات یہ کہ خالی وقت میں ناچا کرو تا کہ بَونے یہ جان جائیں کہ تم بہت اچھّا ناچ سکتی ہو اور وہ خُوش ہو کر تمہیں بھی اپنے ساتھ زمین پر لے جائیں۔"

غزالہ یہ سُن کر اتنی خُوش ہوئی کہ اسی وقت کھڑی ہو کر ناچنے لگی۔ وہ ناچ رہی تھی کہ ایک بَونا آگیا اور اس کو ناچتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”واہ وا! واہ وا!“ وُہ خُوشی سے چلّایا۔ ”تم تو بہت اچھّا ناچتی ہو“!

”جب میں خوش ہوتی ہوں تو اسی طرح ناچتی ہوں۔“ غزّالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم اس وقت کیوں خُوش ہو؟“ بَونے نے پوچھا۔

”میں کیوں نہ خُوش ہوں؟“ غزّالہ نے کہا۔ ”سارے کپڑے دُھل گئے ہیں اور ان پر استری بھی ہو چکی ہے۔“

”تو انہیں اُوپر بھیج دیتے ہیں۔“ بَونے نے کہا۔ جاؤ بھئی کپڑو، اُوپر چلے جاؤ۔“ بَونے کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ سارے کپڑے وہاں سے غائب ہو گئے اور زمین پر پہنچ گئے۔

جیسا کہ عورت نے بتایا تھا، غزّالہ کو جلد ہی دوسرے کام پر لگا دیا گیا۔ یہ کام تھا

چینی کے ان سارے ٹوٹے ہوئے برتنوں کو جوڑنا جنہیں اس نے توڑ ڈالا تھا۔ ایک بَونے نے اُسے برتن جوڑنے کا طریقہ سکھایا اور اس کو ایک ایک کر کے سارے برتن جوڑنے پڑے۔

جب سب برتن جُڑ گئے تو اُوپر بھیج دیے گئے۔ برتن جوڑنے کا طریقہ بتانے والے بَونے نے یہ دیکھ کر حیرت سے اپنی آنکھیں پھاڑیں کہ غزالہ ناچنے لگی ہے۔

"اچھی لڑکی، کیا ناچنا جانتی ہو؟" بَونے نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ کو ناچنا نہیں آتا۔" غزّالہ نے کہا۔

"نہیں۔ البتّہ میں سیکھنا چاہتا ہوں۔" بَونے نے کہا۔ "اصل میں مَیں اپنے کام میں اس قدر مصرُوف رہتا ہوں کہ ناچنا نہیں سیکھ سکا۔ جب سب بَونے اُوپر جاتے ہیں تو میں بھی حسرت سے انہیں دیکھتا ہوں، کیونکہ میں اُوپر نہیں جا سکتا۔"

”آپ اُوپر کیوں نہیں جاسکتے؟“ غزالہ نے پُوچھا۔

”اس لیے کہ جو ناچنا نہ جانتا ہو، وہ اُوپر نہیں جا سکتا۔ اسی لیے مجھے ناچ سکھا دو تاکہ اگلی بار میں بھی زمین پر جا سکوں اور اپنے دوستوں کے ساتھ ساری رات ناچ سکوں۔“

غزّالہ نے بَونے کو ناچنا سکھا دیا۔ دُوسرے دِن بَونوں کا سردار اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”لڑکی، بس اب ایک کام باقی رہ گیا ہے۔ یہاں سے ناک کی سیدھ چلی جاؤ۔ تم ایک میدان میں پہنچو گی جہاں بے شمار دھاگے ہی دھاگے پڑے ہیں۔ یہ سب اُلجھے ہوئے دھاگے ہیں اور یہ دھاگے تمہاری امّی اور اُن کی سہیلیوں کی اُن باتوں کے دھاگے ہیں جنہیں تم نے اپنی ٹانگ اڑا اڑا کر بیچ میں سے توڑ دیا تھا۔ اب تمہیں ان سب دھاگوں کو سُلجھانا پڑے گا۔ یہ تمہارا آخری کام ہے۔ اس کے بعد تم آرام سے یہاں رہ سکتی ہو۔“

غزّالہ ناک کی سیدھ میں چلنے لگی۔ چلتے چلتے وُہ اس میدان میں پہنچ گئی جہاں بے شمار دھاگے اُلجھے پڑے تھے۔ اور یہ سب کے سب اُسے سُلجھانے تھے۔ وُہ

دھاگے اُٹھا اُٹھا کے سُلجھانے لگی۔ ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ کوئی دھاگا کسی رنگ کا تھا، کوئی کسی رنگ کا۔ اس نے سب رنگوں کے دھاگوں کو الگ الگ کرنا شروع کر دیا۔

یہ کام بُہت مُشکل تھا۔ آدھے گھنٹے ہی ہیں غزّالہ کی چیں بول گئی۔ اس کی کمر درد کرنے لگی۔ وُہ سیدھی کھڑی ہو کر آرام کرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس سے ذرا فاصلے پر ایک بَونا ہاتھ میں سِتار لیے کوئی میٹھی سی دُھن بجا رہا ہے۔

ٹُن ٹُن ٹُن

ٹُنا ٹُن ٹُن

غزّالہ کو سِتار سُن کر بڑا مزا آیا۔ اسے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس کا جی ناچنے کو کر رہا ہے۔ وُہ دھیمے دھیمے ناچنے لگی۔

اُسے ناچتا دیکھ کر بَونا اس کے پاس آ گیا اور کہنے لگا۔ ”بھئی، تم بُہت اچھّا ناچتی ہو۔“

غزّالہ نے ناچنا بند کر دیا کیونکہ سِتار بجنا بند ہو گیا تھا۔

"تُم نے ناچنا بند کیوں کر دیا؟ "بَونے نے پُوچھا۔

"اس لیے کہ ابھی میرے پاس کرنے کے لیے ڈھیر سارا کام پڑا ہے۔ وُہ تو اِس سِتار میں نہ جانے کیا جادُو تھا کہ میں خود بخود ناچنے لگی۔" غزّالہ نے کہا۔

"اچھّی لڑکی، اگر میں سِتار بجاؤں تو تمہیں ناچنا ہی پڑے گا کیونکہ میرے سِتار میں یہی خُوبی ہے۔"

"نہیں۔ اب سِتار نہ بجانا، کیونکہ مجھے بہت سارا کام کرنا ہے۔ مجھے یہ تمام دھاگے الگ الگ کرنے ہیں۔ جب میں ان سب دھاگوں کو سُلجھا دوں گی تب آرام کر سکوں گی۔"

"ٹھہرو لڑکی۔ میں سِتار پر جادُو کی ایک دُھن بجاتا ہوں۔ تم ناچو، اس دُھن کے اثر سے ہر رنگ کے دھاگے خُود بخود لہرا لہرا کے الگ ہوتے چلے جائیں گے۔" بَونے نے ہنستے ہوئے کہا۔

بَونے نے اب ایک عجیب و غریب دُھن سِتار پر بجانا شروع کی۔ ایسی دُھن غزّالہ نے آج تک نہیں سنی تھی۔ وہ بے اختیار ناچنے لگی اور ناچتے ناچتے اس نے دیکھا کہ ہر رنگ کے دھاگے اُٹھ اُٹھ کر ناچنے لگے ہیں اور اپنے اپنے رنگوں کے دھاگوں کی طرف چلنے لگے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سب دھاگے اپنے اپنے رنگ کے دھاگوں کے ساتھ مل کر ناچنے لگے۔ ہر دھاگا الگ الگ نظر آ رہا تھا۔ جب بَونے نے جادُو کی موسیقی بند کی تو سب دھاگے اپنی اپنی جگہ ِگر پڑے۔

”جاؤ لڑکی“ بَونے نے کہا۔ ”اب سب دھاگوں کو الگ الگ اُٹھا کے رکھ دو۔ تمہارا کام ختم ہو چُکا ہے۔“

اِتنے میں بَونوں کا سردار آ گیا۔

”اب اِن دھاگوں کا کیا کریں؟“ بَونے نے سردار سے پُوچھا۔

”انہیں ہوا میں اُچھال دو کیونکہ انہیں اُوپر بھیجنے کی ضرورت نہیں۔“

”کیوں سردار؟“

”اس لیے کہ عورتیں زیادہ تربے کار باتیں کرتی ہیں۔ ان کی دس باتوں میں کام کی صرف ایک دو ہی باتیں ہوتی ہیں۔“

☆☆☆

اس طرح غزّالہ کا سب کام ختم ہو گیا۔ اب وُہ بڑی اچھّی لڑکی بن چکی تھی۔ بَونے بھی اب اس سے بہت اچھّی طرح پیش آنے لگے تھے۔

غزّالہ کو اس عورت کی باتیں یاد تھیں، اس لیے وہ ہر وقت بَونوں کو خُوش رکھنے کی کوشش کیا کرتی اور خُود بھی مُسکراتی رہتی۔ وُہ اتنی خوش رہنے لگی تھی کہ بَونوں کے سردار نے اس کا نام ”مُسکرانے والی غزّالہ“ رکھ دیا تھا۔

لیکن وُہ دِل ہی دِل میں اپنی امّی ابّو کو یاد کرتی رہتی تھی۔ جب کبھی بھی وُہ اکیلی ہُوتی تو پھُولوں کی کیاری میں مُنہ چھپا کر امّی کو پُکارتی۔

ایک دِن اس نے اپنا مُنہ پھُولوں کی ایک کیاری میں چھپایا ہوا تھا کہ اچانک اس کیاری کے آس پاس کئی بَونے آ کھڑے ہُوئے۔

”کل چاند کی چودہ تاریخ ہے۔“ ایک بَونے نے کہا۔

”اور موسم بھی فصل کٹنے کا ہے۔“ دُوسرے نے کہا۔

”اِس کا مطلب یہ ہوا۔“ غزّالہ نے سوچا۔ ”کہ مجُھے یہاں آئے ہُوئے پورا ایک مہینا ہو چکا ہے۔ جس دِن میں آئی تھی، اس دن بھی تو چودھویں چاند رات تھی۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ کل ہم جشن منانے اُوپر چلیں گے۔“ ایک بَونے نے دُوسرے سے کہا۔

”ہاں، ہم ضرُور اُوپر جائیں گے۔“ یہ وہی بَونا تھا جس نے غزّالہ سے ناچ سیکھا تھا۔ ”اور ہم غزّالہ کو بھی اُوپر لے چلیں گے۔“

”غزّالہ کو اُوپر لے جانے میں کوئی ہرج تو نہیں؟“ ایک اور بَونے نے سوال کیا۔

”نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی ہرج نہیں۔ تم نہیں دیکھتے کہ وُہ کتنی خوش ہے یہاں پر؟“

”ہاں۔ خُوش تو وہ بہُت نظر آتی ہے۔“

”بس۔ تو پھر اُسے لے جانے میں کیا ہرج ہے؟“

”اور پھر اُس کی آنکھوں میں چھُو چھَم کا سُرمہ بھی تو لگا ہُوا ہے۔ زمین کے لوگ اُسے دیکھ نہیں سکتے۔“

”لیکن اگر چار پتّیوں والا کوئی پھُول اس نے اپنے ہاتھ میں لے کر گھر جانے کی خواہش کی تو؟“

”اوّل تو اسے پتا ہی نہیں کہ وُہ اس طرح گھر کرنے سے گھر جا سکتی ہے، اور دُوسرے وُہ یہاں بہُت خوش ہے۔ پھر بھلا وُہ وُہاں کیُوں جائے گی؟“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بَونوں کا سردار وہاں آ گیا۔ ”کیا باتیں ہو رہی ہیں، بھئی؟“ اُس نے پُوچھا۔

”کل رات چودھویں چاند رات ہے اور فصلوں کی کٹائی کے موسم کا آخری مہینا ہے۔ اس لیے جشن کی بات ہو رہی تھی۔“ ایک بَونے نے ادب سے کہا۔

”ہاں، جشن کی تیّاریاں شروع کر دو۔ اس سال یہ ہمارا آخری جشن ہو گا کیوں کہ پھر سردیاں شروع ہو جائیں گی اور ہم اُوپر نہیں جا سکیں گے۔“

”غزّالہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی نا، سردار؟“ ایک بَونے نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔ وُہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔ اب تو وُہ ہمارے ساتھ خوب گھُل مل گئی ہے۔ اور ناچنا بھی بہت اچھا جانتی ہے۔ اُس کے شریک ہونے سے جشن کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔“ سردار نے خوش ہو کر کہا۔

اور ایسا ہی ہوا۔

اگلی رات چودھویں کا چاند نِکلا تو سب بَونے کھیت میں جشن منانے گئے۔ غزّالہ بھی اُن کے ساتھ تھی۔

سب بَونے ناچ رہے تھے۔ غزّالہ بھی ناچ رہی تھی۔ ناچتے ناچتے وُہ اپنے گھر کی طرف چلی گئی اور زور سے چلّا کر کہا۔ ”امّی! امّی“!

تھوڑی دیر بعد کھڑکی کھلی اور اُس کے ابّو نے جھانک کر دیکھا۔ امّی نے بھی

گردن باہر نکالی اور تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہیں، جیسے انہیں کُچھ نظر نہیں آرہاہو۔ غزّالہ نے پھر چلّاکر کہا: "امّی ! امّی "!

ابّو نے امّی سے کہا۔ "دیکھا؟ میں نہ کہتا تھا کہ جھینگر شور مچارہے ہیں؟ چلو، کمرے میں واپس چلیں۔ غزّالہ بیٹی اکیلی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے کھڑکی بند کردی۔

تب غزّالہ کو اچانک دھیان آیاکہ اُس کی اپنی آنکھوں میں تو چھُو چھَم کا سُرمہ لگا ہُوا ہے اور کوئی آدمی اُسے دیکھ نہیں سکتا۔ ساتھ ہی اُسے یاد آیا کہ اُس عورت نے کہا تھا کہ اگر وہ چار پتّیوں والا پھُول ہاتھ میں لے کر یہ کہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے تو کوئی اُسے نہیں روک سکے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ خوش ہوگئی اور خُدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ جب اس نے امّی امی پُکارا تھا تو اُس وقت بَونے ناچ میں مگن تھے اور کِسی نے اُسے کھڑکی کے پاس آتے اور امّی امّی پُکارتے نہیں سُنا تھا۔

اب وہ بَونوں کے پاس چلی گئی اور خُوب گھُوم گھُوم کے ناچنے لگی۔ وُہ خُوش نظر آنا چاہتی تھی تاکہ بَونوں کو اس پر کوئی شُبہ نہ ہو۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اُسے اتنا اچھے ناچتے دیکھ کر ایک بَونے نے دوسرے بَونے سے کہا۔ "یہ دُوسری لڑکی ہے جو

ہمارے ساتھ رہ کر خُوش ہے۔"

غزّالہ چُپکے چُپکے اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔ وُہ سمجھ گئی کہ پہلی لڑکی وہ عورت تھی جو اسے بَونوں کی دُنیا میں ملی تھی، لیکن اُس نے ظاہر کی کیا کہ اُس کا دھیان بَونوں کی باتوں کی طرف نہیں ہے۔ وہ اور تیز ناچنے لگی۔

اُسے ناچتا دیکھ کر بَونے بھی زور زور سے ناچنے لگے۔ وہ سب بے انتہا خُوش تھے۔ بہُت خُوش۔

"ہاہاہا!" بَونے خُوشی سے چلّائے۔

"ہو ہو ہو ہو!" غزّالہ بھی خُوشی سے چلّائی اور دھپ سے زمین پر گِر پڑی۔ وہ تھک کر نہیں گری تھی مگر بَونے یہی سمجھے کہ وُہ تھک گئی ہے۔ ہُوا یہ تھا کہ ناچتے ناچتے غزّالہ کو زمین پر ایک ننھا سا چار پنکھڑیوں والا پھُول نظر آ گیا تھا اور وُہ اس پھُول کو توڑنے کے لیے اُس پر گِر پڑی تھی۔

جب وُہ ہنستی ہُوئی اُٹھی تو پھُول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے

پیچھے کر رکھے تھے۔ کبھی وُہ ایک پاؤں سے ٹھمکا لگا کر دائیں طرف جاتی اَور کبھی دُوسرے پاؤں سے ٹھمکا لگا کر بائیں طرف جاتی۔ چند لمحوں تک وُہ یُونہی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹھمکتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ سب بَونے خوشی سے مست ہو کر ناچے جا رہے ہیں۔ ناچتے جا رہے ہیں۔ کسی کو اپنا ہُوش نہ تھا۔

غزّالہ نے پھُول والا ہاتھ اپنے سامنے کر لیا اَور زور سے چلّائی۔ ”میں اپنے گھر جانا چاہتی ہُوں۔ میں اپنے امّی ابّو کے پاس جانا چاہتی ہُوں۔“

بَونوں کا ناچ ایک دم رُک گیا۔

بَونوں کا سردار آگے بڑھا اور غزّالہ سے کہنے لگا۔ ”اچھّی غزّالہ، اب تم نے چار پنکھڑیوں والے پھُول کو ہاتھ میں لے کر گھر جانے کی خواہش کر ہی دی ہے تو اتنا تو بتاتی جاؤ کہ آخر تمہیں ہماری دنیا میں کیا غم تھا۔“

”مجھے تمہاری دُنیا میں کوئی دُکھ نہ تھا، اچھّے سردار۔“ غزّالہ نے کہا۔ ”لیکن میں اپنے امّی اور ابّو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”کیا ہماری دُنیا میں کوئی بچّہ اپنے امّی ابّو کے بغیر نہیں رہ سکتا؟“ بَونوں کے سردار نے پوچھا۔

”ہاں۔ ہماری دُنیا میں سب بچّے اپنے اپنے امّی ابّو کے ساتھ ہی خُوش رہتے ہیں۔ غزّالہ نے کہا۔ ”تم ہم سے ناراض ہو کر تو نہیں جا رہی ہو؟“ سردار نے پُوچھا۔

”نہیں۔ میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ تم نے تو مُجھ پر بڑا احسان کیا ہے کہ مُجھے تمیز سکھائی، چیزوں کی قدر کرنا سکھایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امّی اور ابّو سے محبّت کرنا سکھایا۔“

”وُہ کیسے؟“

”وُہ اس طرح کہ جب میں امّی ابّو سے دُور ہُوئی اور ایک مہینا اُن سے دُور رہی، تب میرا جی نہیں لگا اور میں سمجھ گئی کہ میں اُن کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”اچھّا تُم نے گھر جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہم تمھیں ہنسی خُوشی رُخصت کریں گے۔“ بَونوں کے سردار نے کہا۔

یہ سُنتے ہی سب بَونے ناچنے اور گانے لگے:

اچھّی غزّالہ

پیاری غزّالہ

جاؤ، سِدھارو

تم اپنے گھر کو

تھوڑی دیر بعد غزّالہ کی شکل والا پُتلا اُڑتا ہوا وہاں آن ِگرا اور اُس کے آتے ہی غزّالہ زمین پر بے سدھ ہو کر ِگر پڑی۔

☆☆☆

جب غزّالہ کو ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سرہانے میز پر طرح طرح کی دوائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ غزّالہ یہ جان کر مُسکرائی کہ یہ سب دوائیاں اُس پُتلے کو پینی پڑی ہوں گی۔

اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا تو دوسرے پلنگ پر اُس کی امّی سو رہی تھیں۔ وہ اتنی

دُبلی ہو گئی تھیں کہ پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ غزّالہ کا دِل دُکھ سے بھر گیا۔ اُسے امّی پر بڑا ترس آیا جو اُسے بیمار سمجھ کر خود بیمار ہو گئی تھیں۔ حالانکہ وُہ تو بَونوں کی دُنیا میں ٹھیک ٹھاک تھی۔

"امّی، امّی! میری پیاری امّی!" غزّالہ نے پُکارا۔

امّی ہڑبڑا کر اُٹھیں۔ شاید وُہ اُسی وقت سوئی تھیں۔ وُہ سیدھی اُس پر آکر جھک گئیں اور اُس کی پیشانی پیار سے چومتی ہوئی بولیں۔ "ارے میں قربان۔ میں صدقے۔ میری بچّی بول پڑی۔ اے خُدا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اجی میں نے کہا سُنتے ہو؟" اُنہوں نے غزّالہ کے ابّو کو پُکارا جو دوسرے کمرے میں مُصلّے پر بیٹھے غزّالہ کے ٹھیک ہونے کی دُعا مانگ رہے تھے۔

ابّو دُوڑے دُوڑے آئے اور جب غزّالہ کو پلنگ پر بیٹھے دیکھا تو دُوڑ کر اُس کو پیار کیا اور بولے۔ "میری پیاری بچّی۔۔ میری غزّالہ۔ خُدا کا شکر ہے کہ تمہیں آخر ہوش آ ہی گیا۔" "لیکن ابّو، میں بے ہُوش کب تھی؟" غزّالہ نے حیرت سے پُوچھا۔

”تم آرام کرو، بیٹی۔“ ابّو نے اُسے پلنگ پر لِٹاتے ہُوئے کہا۔ ”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ جب تمہیں ہُوش آ جائے تو ذرا کم بولنا۔“

”اور ہاں، تمہاری دوا کا وقت بھی تو ہو گیا ہے۔“ امّی نے ایک پُڑیا میز سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں دوا نہیں پیوں گی امّی۔ میں ٹھیک ہُوں۔“ غزّالہ نے کہا۔ ”لیکن اُسی لمحے یاد آیا کہ امّی ابّو کے لیے تو وُہ بیمار ہی ہو گی اور بے ہوش بھی۔ کیونکہ جو پُتلا اس کی جگہ اُن کے پاس ایک مہینے تک رہا وُہ اُس کی طرح بُول نہیں سکتا تھا، اسی لیے تو امّی ابّو اُسے بے ہوش سمجھ کر اُس کا علاج کرتے رہے۔

یہ خیال آتے ہی غزّالہ نے امّی سے کہا۔ ”اچھا امّی، میں دوا پِیے لیتی ہوں۔“

امّی نے حیرت سے ابّو کی طرف دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار اُن کی بیٹی نے اِتنے میٹھے انداز میں بات کی تھی اور یُوں پیار سے اُن کی بات مان لی تھی۔ وہ غزّالہ پر اور بھی صدقے واری ہونے لگیں۔

ابھی غزّالہ کی امّی اُسے پیار سے دوا پلا کے ہٹی ہی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔

غزّالہ انہیں دیکھ کر مُسکرائی۔

”آخر تمہیں ہوش آ ہی گیا۔ اب کیسی طبیعت ہے؟“

”جی، میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اب مہربانی کر کے دوا بند کر دیجیے۔ مُجھے دوا کی بالکل ضرُورت نہیں۔“ غزّالہ نے بُہت ادب اور تمیز سے کہا۔

”نہیں بی بی۔“ ڈاکٹر نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اتنے دِنوں کے بعد ہوش آیا ہے۔ کافی کمزور ہو گئی ہو۔ کُچھ دن دوا پینی ہی پڑے گی۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب، میں بے ہوش کب تھی؟ میں نے تو آپ کو آج ہی اس کمرے میں آتے دیکھا ہے۔“

”تُم بے ہوش تھیں نا۔ پھر تمہیں کیسے کوئی چیز نظر آتی؟“ ”لیکن ڈاکٹر صاحب، میں بے ہوش کہاں تھی! میں تو بالکل اچھّی بھلی تھی، البتّہ یہاں نہیں تھی۔“

”یہاں نہیں تھیں؟“ امّی، ابّو اور ڈاکٹر تینوں نے حیرت سے پُوچھا۔ ”تو اور کہاں

تھیں؟ "

"میں بَونوں کی دُنیا میں تھی۔" غزّالہ نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "وُہ مُجھے پچھلے چاند کی چودھویں رات کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔"

"پچھلے چاند کی چودھویں رات؟" غزّالہ کی امّی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ لیکن تُم اُس رات چُپکے سے گھر سے نکل کر کھیت میں چلی گئی تھیں۔ جب ہم نے تمہیں ڈھونڈا تو اس وقت گیہوں کے گٹھّوں کے پاس بے ہوش پڑی ہوئی تھیں۔"

"نہیں امّی۔ وہ میں نہیں تھی۔ "

"تو اور کون تھا؟"

"وہ تو ایک پُتلا تھا جسے بَونوں نے میری شکل کا بنا کر وہاں ڈال دیا تھا۔ میں تو پورا ایک مہینا بَونوں کی دُنیا میں اُن کے ساتھ تھی، اور ان سے کام کرنا سیکھا، تمیز سیکھی، ادب سیکھا، امّی ابّو سے محبّت کرنا اور اُن کی بات ماننا سیکھا۔ خُدا کا شکر ہے

کہ آج رات جب وہ سب ناچنے کے لیے زمین کے اُوپر آئے تو مُجھے چار پنکھڑیوں والا پھُول مل گیا اور میں نے اُسے اپنے ہاتھ میں لے کر گھر آنے کی خواہش کی۔۔۔تب پُتلا یہاں سے چلا گیا اور مَیں یہاں آگئی۔"

امّی اور ابّو حیرت سے غزّالہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب وُہ اپنی بات پوری کر چُکی تو اُنھوں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"ان باتوں کے بارے میں تو میرا کوئی خیال نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "البتّہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ غزّالہ بی بی ایک مہینے تک تو بالکل بے ہوش تھیں اور آج بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ میرا خیال ہے، اب انھیں کِسی دوا کی ضرورت نہیں۔"

ڈاکٹر کے جاتے ہی غزّالہ نے امّی اور ابّو کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگی۔ "میں نے آپ کو بہُت ستایا ہے۔ خُدا کے لیے مُجھے معاف کر دیجیے۔"

امّی اور ابّو نے حیرت سے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا اور پھِر جھُک کر غزّالہ کو پیار کرنے لگے۔